

## Study Material

### میر تقی میر کی عزل کونی

میر اردو شاعری کے و عظیم غزل گو شاعر ہے جن کو حیات جاوید حاصل ہے میر اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں ناسخ ذوق مؤمن اور غالب جیسے بلند پایا شعرا میر کی عظمت کے قائل ہیں ذوق نے کیا خوب کہا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب  
زوق یاروں نے بہت زور

غزل میں مارا

میں آگرہ کے ایک شریف خاندان کے چشمہ چراغ تھے۔ والدہ ایک صوفی منش بزرگ تھے میر کو انہوں نے ابتداء سے ہی اپنے ڈھنگ پر لگایا ان کو دنیا سے بے نیاز اور عشق مولا میں سر شار رہنے کی تعلیم دی۔

میر کو بچپن سے ہی شعر و سخن کا بے حد و شوق تھا بچپن میں ہی شعر کہنے لگے تھے – میر کی زندگی بڑی بے چارگی اور پریشان حال میں گزری - دس سال کے تھے کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ میر نے زندگی بھر غم اٹھائے اور پریشان حال رہے والد کا انتقال کے بعد گھر سے نکل پڑے تھے چچا کا بھی انتقال ہو گیا تھا بھائی اور ماموں سخت دشمن ہو گئے -

آگہ چھوڑ کر دہلی پہنچے وہاں بھی سیکڑوں پریشانیوں اور مصائب کا سامنا نا کرنا پڑا۔ دہلی سے لکھنؤ آئے مگر وہاں بھی ان کی خوار طبیعت کو سکون نہیں ملا۔ ان تمام پریشانیوں اور مصیبتوں کا نفسیاتی اثر پڑا۔ ان کو بھی غموں سے فرست نہ ملی –

میر کی شاعری ان کی زندگی کا عکس ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کے پیش کیا۔ وہ زندگی میں سر مستی اور کیف کا ایک گوشہ تلاش کر لیتے ہیں ان کی غزلوں میں انداز بیان اور لہجے نے صرف اپنے دور کے ہی لوگوں کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس کا اثر آج کے شعراء پر بھی بہت گہرا پڑا ہے۔ فانی اسکی بہترین مثال میں میر

کو شق سے عشق تھا ان کے یہاں عشق مجازی کی نمایاں جھلک ہے مگر عشق کو  
ناکامیوں نے میر کی حالت عجیب کر دی۔

میر کی تجھ سے توقع تھی ستم گر نکلا  
موسم سمجھے تھے تیرے دل  
کو سو پہر نکلا

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بیتاب  
کسی تسکین کے لئے  
گھر سے باہر نکلا

میر شق میں بے خود ہو کر اتنے منتظر نظر آئے ہیں۔

بے خودی لے گئی کہاں مجھ کو  
دیر سے انتظار ہے اپنا

میر کے بہترین اشعار وہ ہیں جو ان کے سچے جذبات اور ناکام محبت کے حقیقی ترجمان  
میں زبان نہایت سادہ روانی میں دیکھا

اور محسوس کیا۔ میر عشق کی واردات قلبی بیان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔  
خارجی اظہار کے بیان میں میر کو کمال حاصل ہے ان کا مشہور شعر اس بات کی دلالت  
کرتے ہیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے  
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

ساری مستی

میر ان نیم باز آنکھوں میں

شراب کی سی ہے

---

## پریم چند کی افسانہ نگاری

اردو کی باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز پریم چند نے ہی کیا۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول سے کیا اور بعد میں افسانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ پریم چند نے افسانے کی بنیاد حقیقت پسندی پر رکھی ان کا پہلا افسانہ انمول رتن 1909 میں لکھا گیا۔ اس سال ان کے پانچ افسانے، 'سوزوطن' کے نام سے شائع ہوئے۔ اس میں انہوں نے قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات کا اظہار کیا۔ ان کے افسانہ نگاری کا دوسرا دور 'سوزوطن' کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اب انہوں نے نواب رائے کے بجائے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا اس دور کی نہایت کامیاب کہانی بڑے گھر کی بیٹی ”۱۹۱۰ میں لکھی گئی اس کہانی سے انہوں نے افسانہ نگاری کی باضابطہ داغ بیل ڈالی۔ ۱۹۱۵ میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ”پریم پچھلی شائع ہوا ۱۹۱۸ میں پریم بھی حصہ دوم شائع ہوا۔ ۱۹۲۰ میں پریم بتیسری ۱۹۲۸ میں مجموعہ ”خاک پروانہ منظر عام پر آیا۔ ۱۹۳۰ میں پریم چالیسی ۱۹۳۴ میں آخری تحفہ اور ۱۹۳۶ میں زادراہ شائع ہوا۔ اس طرح انہوں نے ۲۸۰ کہانیاں لکھیں آخری دور کی نہایت مشہور کہانی کفن ہے جو ۱۹۳۵ میں لکھی گئی۔ یہ کہانی پریم چند کی کامیاب ترین کہانی ہے۔

پریم چند شیکسپیر کی طرح فطرت انسان کے کامیاب نباض ہیں۔ دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دینا۔ دلوں کی کسک اور اضطراب تیرے چہرے بھانپ لینا۔ ان کے لئے ایک عام بات ہے بچپن سے لے کر شباب اور شباب سے لے کر بڑھاپے تک انسان پر طاری

ہونے والی ساری کیفیات ہر طرح کے جذبات گونا گوں واردات خوشی غم محبت \_ غریبی امیری غلامی حاکمیت اقتدار مجبوری غرض سو ساینٹی کا کون سا گوشہ اور انسانی قلب کی نقہ ہے جس میں جا کر وہ جھانک کر نہ آتے ہیں اسری جستجو اور بصیرت نے انہیں

درجہ کمال عطا کیا ہے وہ انسانوں کے پلاٹ ہندوستانی معاشرے کے گونا گوں پہلوؤں سے اخذ کرتے ہیں انہوں نے ہندوستان کے دیہاتوں میں

رہنے والے کسانوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اور ہر گوشے کی تصویر کھنچتے ہیں۔ انہیں ہندوستانی لوگوں سے غیر معمولی ہمدروی ہے۔ اور ذات پات کی تفریق کو ناپسند کرتے ہیں کچھ متوسط طبقہ کے مسائل پر ان کے خاص نگاہ ہے۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے

"یہ پریم چند کاکام تھا کہ انہوں نے محنت کش عوام کی اپنے افسانوی اور ناولوں کے پیرو بنایا۔ اور اس دنیا کی تصور کی جو سب سے زیادہ جاندار سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ انسانیت اور دوستی کی مظہر تھی۔ وہ پہلے ادیب ہیں۔ جنہوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعے عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں انسانی دوستی کی طرف قدم اٹھایا

یہ چند نے اپنے افسانوں میں دعوات کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے وہ گاؤں میں پلے پڑھے تھے۔ اور ہندوستانی گاؤں ان کے روم روم میں بسا تھا۔ انہوں نے گاؤں دیہات کی اصلیت کو جوں کا توں افسانوں میں دکھایا۔

ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں۔ " سرسید حالی شبلی کے بعد اگر کسی ادیب کا طرز تحریر اس کی شخصیت کی بھر پور نمائندگی کرتا ہے تو وہ پریم چند ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کو ماحول کے حساب سے بہت سنوار کر پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے افسانوں میں عام انسانوں کو چنا۔ بقول ایک نقاد اپنے کرداروں کو شہزادوں سے بڑھ کر جشن اور پرستان کی پریوں سے زیادہ دل نوازی بخشی۔ ان کے موضوعات سے زیادہ ان کا فن اہم ہے انجمن ترقی پسند کے جلسے میں انہوں نے کہا تھا کہ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور روشنی پیدا کرے۔ ان کے افسانوی مجموعے اس طرح ہیں سوز وطن، پریم پچھسی، پریم بتیسی، خاک پروانہ، پریم چالیسی، آخری تحفہ، زادراہ، دودھ کی قیمت، واردات، نمک کا داروغہ، برے گھر کی بیٹی وغیرہ افسانے کردار نگاروں کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی قائم کردہ روایت کی مدتوں تک افسانہ نگاروں نے

## احمد ندیم قاسمی

20 نومبر 1916 کو ظلع شاہ پور پنجاب کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے جس گھر میں احمد ندیم قاسمی پیدا ہوئے یہ کبھی دینوی حشمت کی وجہ سے بہت ممتاز تھا مگر ان کی ولادت کے زمانے میں وہ حشمت ختم ہو چکی تھی۔ اور بقول خود، " جب میں نے آنکھ کھولی تو میرا گھر افلاس بدحالی کا عجیب مرقع تھا۔ " ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی 1923ء میں والد کے انتقال کے بعد تعلیم و تربیت ان کے چچانے کی۔ چچا بلوچود سرکاری ملازمت کے علم و ادب کے دلدہ تھے۔ عربی و فارسی سے بڑا شغف تھا۔ اردو سے بھی کافی دلچسپی تھی اقبال کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ اس لئے اقبال کی شاعری کا برابری کر دیا کرتے تھے۔ ان کے کلام سے بڑا انس تھا اور یہیں

ان کے مختلف اضلاع میں ۱۹۳۵ میں بی اے پاس کر کے بڑی سے بڑی چھوٹی سے چھوٹی نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ کبھی بیس روپیے کی ملازمت کی کبھی چالیس کی غرض کہ زندگی بدحالی میں گزری۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں کسب معاش کے لئے دوڑتے رہے۔ 1939 میں ملتان کے محکمہ آب کاری میں کام کرنا شروع کر دیا لیکن تین سال بعد ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ احمد ندیم کی ادبی زندگی کا نیا دور تھا۔ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ایک سال بعد ادب لطیف کے مدیر ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء میں اس سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ اس وقت احمد ندیم قاسمی ادبی و علمی مشاغل کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ علاوہ اور کاموں کے اب گلی پاکستان ترقی پسند انجمن مصنفین کے سکرٹری بھی رہے۔ احمد ندیم قاسمی کلام کی بدولت اردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں ان کا مجموعہ کلام جلال و حجال شائع ہو چکا ہے۔ جس کے دیکھنے سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا۔ کلام میں جو ذہن کو اپنی

طرف متوجہ کرتی ہے وہ تنوع ہے۔ مضامین میں بھی تنوع ہے۔ یہ خوبی صرف ایک ذہین اور زمانہ شناس فن کار ہی کے یہاں پیدا ہو سکتی ہے ورنہ تقلید سے شاعر کو بچنا

مشکل ہو جاتا ہے۔ ندیم کے طرزِ بیاں میں بھی ایک خاص ندرت ہے۔ لب و لہجہ میں ایک ایسا تیکھا پن ہے جو سارے کلام میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ زبان نکسالی و با محاورہ کم ہے فارسی و عربی کی تراکیب سے عموماً کام لیتے ہیں۔ لیکن روانی میں فرق نہیں آتا۔ ان کا اندازِ مخاطب نہایت دلکش اور پر تاثیر ہے۔ ورنہ غالباً یہ ہے کہ وہ جب کسی بات کو محسوس کرتے ہیں تو شدت کے ساتھ اس کا اثر لیتے ہیں اور احساسِ صداقت بے باکی اور برجستگی کے علاوہ کلام میں خلوص اور جوش ابھار دیتا

ہے۔ چونکہ ندیم کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور زندگی اب تک دکھ اور درد کا شکار ہوتی چلی آئی ہے اس لئے موضوع یا خیال میں نہ تو تکرار ہے اور نہ تازگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شاعروں کو ہمیشہ بے اثری اور واعظانہ انداز سے بچاتے ہیں۔ کلام میں درد کیک پیدا کرنے کی کوشش ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں للکار اور خطیبانہ خروشی بہت کم ہے عموماً وہ دقیقِ انتظری سے کام لے کر اپنی شاعری میں مظلمت و معنویت پیدا کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ تشبیہ استعارے بڑے حسین نظم کرتے ہیں۔ منظر نگاری کلب میں ان کا قلم دو پر کاری نہیں پیدا کر سکا جو جوش یا سردار علی جعفری کو حاصل ہے۔ البتہ متانت و سنجیدگی سے کلام مالا مال نظر آتا ہے۔

---

## منفر دلب ولہجہ کا شاعر مدحت الاخر

( شاہد کبیر )

چھٹی دہائی کے ابتدائی چند سال شعر و ادب میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دنوں جہاں ایک پرانی تحریر یک دم توڑ رہی تھی۔ وہیں ایک نیا ادبی رجحان جنم لے رہا تھا۔ یہ رجحان کسی باقاعدہ ادبی تحریک کا نتیجہ نہیں تھا۔ چنانچہ اختلافی مسائل کا شکار بھی رہا۔ جدید شعری ادب میں خصوصاً غزل جہاں تیزی سے مقبولیت کے مراحل طے کر رہی تھی وہیں غیر مساعد حالات سے بھی گزر رہی تھی۔ جدید غزل پر جہاں اپنے عہد سے

بے خبری کا الزام تھا۔ وہیں اس کے لب و لہجہ کولسانی شکست و ریخت کا نام دیا جا رہا تھا۔ ب کہ حقیقت دیتی کہ نیا اسلوب گل و بلبل اور صیاد و باغیاں کی گرفت سے آزاد ہو کر اردو غزل کو ایسی لفظیات اور علامات سے روشناس کردار کا تھا جو زندگی کے قریب اور زیادہ معنی خیز تھیں۔ مگر یہ نمایاں فرق پچھلی صدی کے ماحول سے جڑے ہوئے بزرگوں کو نظر

نہیں آ رہا تھا۔ ان موافق حالات ہی جدید لب و لہجہ کی توانائی سے متاثر ہونے والی نئی نسل کے جو شعراء تنقید اور الزامات سے بے نیاز ہو کر اعتماد اور لگن کے ساتھ جدید غزل کی آرائش میں مصروف تھے ان میں ایک نام مدحت الاختر بھی تھا۔ اگر جدید شاعری پر عصری نام کی اور اپنے معاشرے کے لیے بے کافی کا الزام ہے تو مدحت جدید سام شاعر ہیں تو جدید غزل پر عصری نا آگہی اور اپنے معاشرے کی سے زیادہ مضحکہ خیز کوئی الزام ہی نہیں بولتا۔ میں روز و شب کا شاعر نہ صرف اپنے معاشرے سے پوری طر ہے بلکہ اپنے گردوپیش کے ماحول پر بھی تیز سدحت الاختر کا المیہ ان کی اپنی بصیرت کا زخم ہے۔ خلوتیں بیچ کے محفل کو خریدا جائے اب تو آنکھوں سے میدان حیرانہ دیکھا جا۔ آئے دیکھتے ہیں کہ کیا ذیل کے اشعار اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔

مجھ کو برابرا کے و ہاچھا تو بن گیا      اچھا ہوا چلو کوئی بگڑ اتو بن گیا

جھلکتا ہے تری ہر بات سے سچ      ترا لہجہ ابھی کچا بہت ہے

مدحت الاختر جس جسارت اور صاف گوئی سے معاشرے کے کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ ان مخصوص اور منفرد لب و لہجہ ہے مگر اس سے جا کر ان کے اظہار خیال کا وہ جرات مندانہ انداز ہے جس میں وہ اپنی ذات کے حوالے سے قارئین کو زندگی کی تلخیوں سے روشناس کرواتے ہیں۔

روتے ہیں مگر آنکھ سے آنسو نہیں بہتے

ہم سا کوئی دنیا میں ریا کار نہیں ہے

مدحت الاخر کے بیشتر اشعار کی گہری سوچ اور فکر کے حامل ہوتے ہیں ان اشعار میں معافی کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور قاری فراگیری میں ڈوب جاتا ہے۔

کاغذ پر ایک درخت کی تصویر اور بحث کس جا کھلینگے پھول کہاں پھل اگا ئیں گے۔

اسی خیال میں صدیاں گزار دی ہم نے جو آج نہ ہوا خیریت سے کل ہوگا

وہیو جدید شعراء کی طرح مدحت نے بھی اساطیری ادب اور طلسمی داستانوں کی اصطلاحوں سے استغفادہ کیا ہے اور یہاں بھی اپنے منفرد اور معصومانہ انداز کو برقرار رکھا ہے صرف دو شعر

کب اپنے کئے گا مجھے اقرار نہیں ہے

وہ سنگ اٹھائے جو گنہ گار نہیں ہے

میں ہوں دیوار پہ لکھا ہوا کب سے لیکن

کوئی پڑھتا نہیں رستے سے گزرنے والا

یہی نہیں بلکہ جہاں انہوں نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا ہے وہاں بھی انفرادیت کی فضا کو قائم رکھا ہے جسے بخوبی سمجھنے کے

لئے ایک ہی ہجو کے چند اشعار ے

خدا کے نام پہ جھوٹے حلف اٹھا تا ہے

کئے ہیں اس نے اسہی تیر سے شکار بہت

---

## محمد داؤد خان اختر شیرانی

محمد اختر شیرانی کا پورا نام محمد داؤد خان اختر شیرانی ہے۔

ان کے والد حافظ محمود شیرانی اپنے وقت کے بلند پایہ محقق تھے۔ اختر شیرانی کی پیدائش اجستھان کے شہر ٹونک میں ہوئی اس کے بعد ان کی پرورش پاکستان کے شہر لاہور میں ہوئی۔ صابر علی خاں سے اصلاح لی اور جلد ہی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے۔

شعری خصوصیات:

وہ شاعری میں سنجیدہ فکر، فلسفیانہ فکر رکھتے ہیں وہ صرف رومانی شاعر ہیں ان کینظموں میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی حسین جلوہ گر نظر آتا ہے۔ ایک نقاد کے کہنے کے مطابق ان کی شاعری فلسفہ و تصوف کے بجائے عشق مجازی کے لطیف جزبات اور وجدانگیر عنایت سے معمور ہے۔

اختر کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کی محبت افلاطونی انداز کی ہے گوشت پوشت کا ایک مادری پیکر رکھنے کے باوجود عورت کا سراپا تخلیقی ہی نظر آتا ہے وہ اختر کی شاعری میں اپنے وجود سے بلند ہو کر ما بعد الطبیعات حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

---